مدح کے چند عمومی محرکات

Allegorical literature exists in almost all languages of the world. A historical an dcultural study of the Ancient period is an evidence of the fact that during this period, human society was divided into three main social groups. One group was that of the Kings and rulers, the second of intellectuals and educationists and the third that of the lower class and slaves. With a slight difference even today, human society is still divided in the same socieal groups and hte motivations for producing allegorical literature in the historical, cultural and literary context. It also provides an analysis of its various types different linguistic periods.

~~~~~~~~~~~

قدیم انسان تنہا اور کمزور تھا۔ کائنات اور اس کی پرہیبت اور جلالی اشیا کے بارے میں اس کی کم علمی نے اسے خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انواع و اقسام کی ذہنی اور فکری الجھنیں اس کا مقدر تھیں۔ فطرت کی غیر مسخر قوتوں نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ اسے خوراک کے حصول اور محفوظ مساکن کی تلاش میں دشوار ترین ماحول پر قابو حاصل کرنا اور صبر آزما مرحلوں سے گزرنا ہوتا تھا۔ اس کی کامیابیاں اور کامرانیاں اسے متکبر اور نرگسیت پسند بناتی تھیں

Scanned by CamScanner
~~~~~~~~~~~

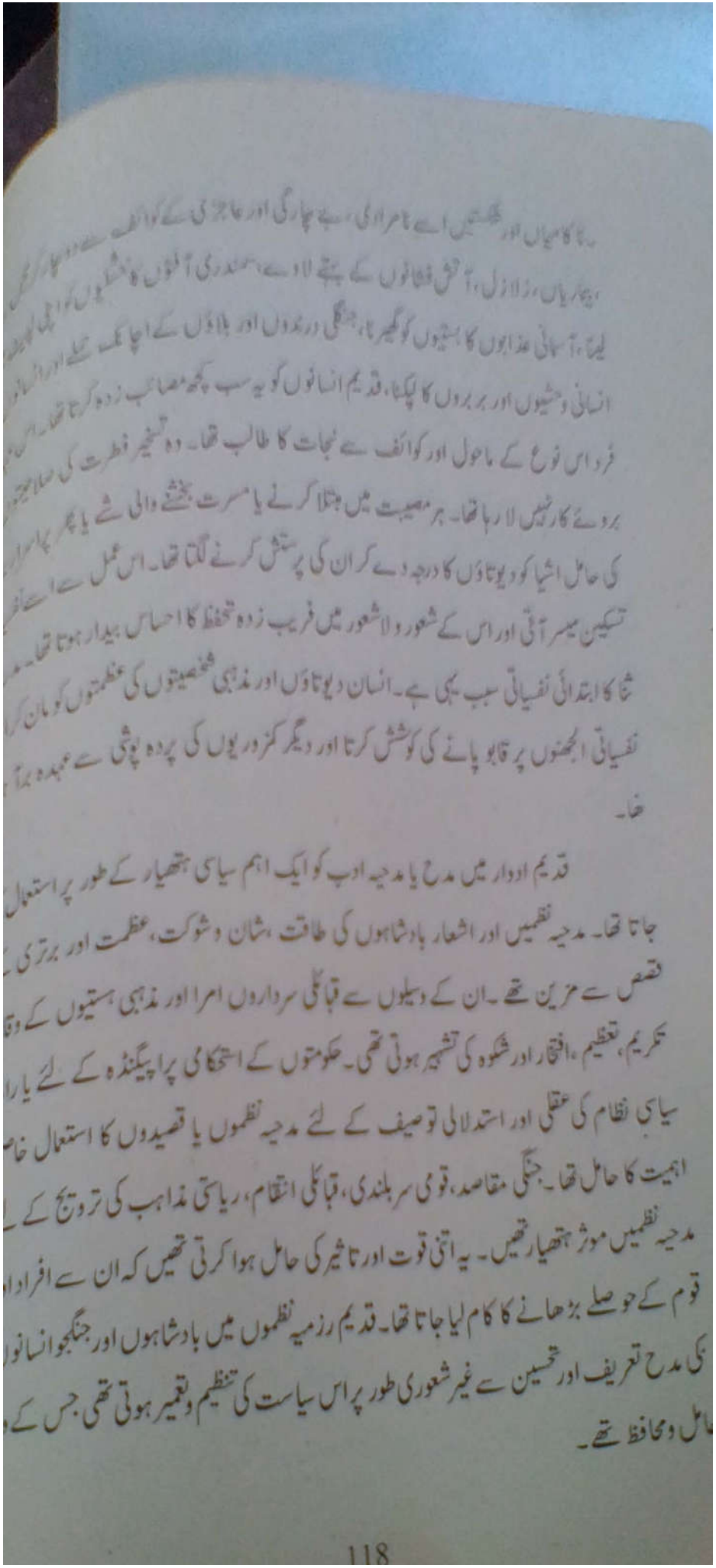

، ناکامیاں اور شکستیں اسے نامرادی، بے چارگی اور عاجزی کے کوائف سے دوچار کر
، بیماریاں، زلازل، آتش فشانوں کے پھٹتے لاوے، سمندری آفتوں کا کشتیوں کو اپنی لپیٹ
لینا، آسمانی عذابوں کا بستیوں کو گھیرنا، جنگلی درندوں اور بلاؤں کے اچانک حملے اور انسانو
انسانی وحشیوں اور بربروں کا لپکنا، قدیم انسانوں کو یہ سب کچھ مصائب زدہ کرتا تھا۔ اس
فرد اس نوع کے ماحول اور کوائف سے نجات کا طالب تھا۔ وہ تسخیر فطرت کی صلاحیتو
بروئے کار نہیں لا رہا تھا۔ ہر مصیبت میں مبتلا کرنے یا مسرت بخشنے والی شے یا پھر پراسرار
کی حامل اشیا کو دیوتاؤں کا درجہ دے کر ان کی پرستش کرنے لگتا تھا۔ اس عمل سے اسے عا
تسکین میسر آتی اور اس کے شعور و لاشعور میں فریب زدہ تحفظ کا احساس بیدار ہوتا تھا۔ مد
ثنا کا ابتدائی نفسیاتی سبب یہی ہے۔ انسان دیوتاؤں اور مذہبی شخصیتوں کی عظمتوں کو مان کر
نفسیاتی الجھنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور دیگر کمزوریوں کی پردہ پوشی سے عہدہ برآ ہو
تھا۔

قدیم ادوار میں مدح یا مدحیہ ادب کو ایک اہم سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال
جاتا تھا۔ مدحیہ نظمیں اور اشعار بادشاہوں کی طاقت، شان و شوکت، عظمت اور برتری
قصص سے مزین تھے۔ ان کے وسیلوں سے قبائلی سرداروں امرا اور مذہبی ہستیوں کے وقا
تکریم، تعظیم، افتخار اور شکوہ کی تشہیر ہوتی تھی۔ حکومتوں کے استحکامی پراپیگنڈہ کے لئے یا را
سیاسی نظام کی عقلی اور استدلالی توصیف کے لئے مدحیہ نظموں یا قصیدوں کا استعمال خا
اہمیت کا حامل تھا۔ جنگی مقاصد، قومی سربلندی، قبائلی انتقام، ریاستی مذاہب کی ترویج کے
مدحیہ نظمیں موثر ہتھیار تھیں۔ یہ اتنی قوت اور تاثیر کی حامل ہوا کرتی تھیں کہ ان سے افراد ا
قوم کے حوصلے بڑھانے کا کام لیا جاتا تھا۔ قدیم رزمیہ نظموں میں بادشاہوں اور جنگجو انسانو
کی مدح تعریف اور تحسین سے غیر شعوری طور پر اس سیاست کی تنظیم و تعمیر ہوتی تھی جس کے
امل و محافظ تھے۔

Scanned by CamScanner

تقریباً ریاستوں میں درباری شعرا کی قسم کے مقاصد پورے کرتے تھے۔ وہ اپنی نظموں کے وسیلے سے مروجہ نظام حکومت و سیاست کو درباریوں اور شہریوں کے ذہنوں میں فکری طور پر راسخ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اس نظام کو ابدی قدروں کا حامل قرار دیتے تھے۔ شاہی قوانین کو خدائی قوانین سے منسوب کر کے بادشاہوں اور حاکموں کی مطلق العنانیوں پر فکری اور جذباتی خول چڑھاتے تھے۔ بادشاہ اور حکمران اس کے عوض انہیں بیش قیمت انعامات سے نوازتے تھے۔ یوں شاعروں کے ضمیروں میں موجود آزادی اظہار کی تمنائیں دب جاتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی نئے طالع آزما شاعر درباروں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مروجہ نظام حکومت کی چیرہ دستیوں اور حکمرانوں کے مظالم کے خلاف آواز صداقت بلند کرنے کی جرأتیں خاموشیوں کی گہری اندھی قبروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی جب شاعروں سے بادشاہ یا بادشاہ سے شاعر ناراض ہو جاتے تھے تو وہ ہجو یہ شاعری کی جانب رجوع کرتے تھے۔

مدحیہ شاعری کی مزید سیاسی افادیت یہ تھی کہ اس میں حکومتوں اور حکمرانوں کا تاریخی، سیاسی اور احوالاتی ریکارڈ محفوظ ہو جاتا تھا۔ کسی عہد کی مخصوص معاشرتی رسوم اور عقائد کا ذخیرہ ان کے وسیلے سے بھی قارئین تک پہنچا ہے۔ ان میں متعلقہ ادوار کے معاشرتی رویے اور رجحانات عکس فگن نظر آتے ہیں۔ رائج علوم وفنون کی اہم جزئیات کی خبریں ملتی ہیں۔ دنیا کے مختلف سیاسی نظاموں اور رنگا رنگ معاشرتوں میں موجود اخلاقی اور عمومی رویوں کے اثاثے ان مدحیہ نظموں کے اشعار میں منعکس ہوئے ہیں۔ بوقلموں ثقافتی ماحولوں کی بھرپور عکاسی ہاتھ لگتی ہے۔ متنوع معاشرتی نظاموں کی ایسی جزئیات کا ذخیرہ میسر آتا ہے جسے شاعروں نے ذہنی، تخیلاتی اور مشاہداتی تناظر میں جمع کیا تھا۔ ان نظموں کی اہمیت یہ بھی تھی کہ ان میں بادشاہوں، امیروں اور قبائلی سرداروں کے جو مثالی کردار پیش کئے جاتے تھے بسا اوقات ان کے ممدوحین کے شعور اور رویے میں نمایاں تبدیلیاں آتی تھیں اور جب بخیلوں، ظالموں، غیر

Scanned by CamScanner

مصلحوں اور قوم پرستوں کے علاوہ حکمرانوں کی بھی، رسول، عادل اور [illegible] سائنس دانوں اور مذہبی پیشواؤں کے ساتھ شعراء کی بھی ہوتی تھی اور اس میں [illegible]

ہے ہم تاریخ اور سماج کے تناظر میں مدح کی روایات کو [illegible] ہے کہ تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں نہ صرف مدح کے اغراض و مقاصد کے رویے اور تقاضات بھی مختلف تھے۔ قدیم ادوار کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ [illegible] ہے کہ قدیم سماج اس عہد میں بھی بڑے معاشرتی گروہوں میں منقسم تھا۔ ایک گروہ اور حکمرانوں کا تھا، دوسرا دانشوروں، پجاریوں اور مبلغوں کا تھا اور تیسرا گروہ غلاموں کا تھا۔ بادشاہوں اور امراء کو دیوتاؤں کا قائم مقام ٹھہرایا جاتا تھا۔ دانشور، پجاری نچلے طبقوں اور غلاموں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتے تھے اور معاشرتی، سیاسی، قبائلی یا روحانی رابطہ نظریات کے محافظ اور نظریہ ساز ہوا کرتے تھے۔ نچلے طبقوں کے افراد تمام محنت و مشقت کے عادی تھے۔ بالائی طبقوں کی خدمت ان کے فرائض میں شامل تھی۔ علم فلسفے اور دانش سے وہ غیر متعلق ہی رہتے تھے۔ قدیم ادوار تین بڑی اکائیوں میں منقسم تھے

ا۔ قبائلی ب۔ مذہبی ج۔ سلاطینی

قبائلی دور میں ٹوٹمی اور تیجویائی روایات کی کارفرمائی تھی۔ یعنی بزرگ اور سرپرست روح یا دیوتا قبائلی سماج میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ مذہبی سماج میں روحانیت کا دور دورہ تھا۔ آسمانی اور برتر ہستیوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سلاطینی سماج میں حکمران علی الاعلان ذاتی قوانین اور مطلق العنانیت کے جھنڈے تلے عوام کو جمع کرتے تھے اور بسا اوقات مذہبی اور روحانی رسوم و روایات کی پرواہ بھی نہیں کرتے تھے۔ قبائلی سماج میں مدح کے اغراض و مقاصد میں سرپرست روح کی حمد و ثنا کو اولین اہمیت حاصل تھی۔ مذہبی سماج میں روحانی ہستیوں (خدا، پیغمبر، پادری، پجاری) کی مدح سرائی کو فوقیت حاصل تھی۔ مذکورہ سماجی اکائیاں علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن تاریخ انسانی کے مختلف زمانوں میں یہ یکجا اور متحد بھی ہوئی ہیں۔

Scanned by CamScanner

جیسا کہ اکثر سماج یا تو قبائلی مذہبی سماج تھے یا سلاطینی مذہبی۔ سلاطینی سماج میں قبائلی اور مذہبی روایات کی کرشمیں نظر آتی ہیں اور مذہبی سماجوں میں سلاطینی اور قبائلی روایات کے ستارے چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔

قدیم سماجوں کی کلی یا جزوی صورتوں میں امرا کا طبقہ ہی حقیقی حکمران ہوا کرتا تھا۔ ان کے پاس طاقت بھی ہوتی تھی اور دنیاوی اور مادی اسباب کی کثرت بھی۔ انہی اثاثوں کی بدولت انہیں سماج میں بلند مقام حاصل تھا۔ غلاموں یا نچلے طبقوں کے افراد کو تعریف و تحسین کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بسا اوقات غلام اور نچلے طبقے کے افراد بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتے تھے لیکن مدح کے مستحق امرا یا ان کے آقا ہی ہوا کرتے تھے۔ جدید ادوار میں جہاں جہاں اقتدار عوام اور وسیع تر طبقوں کے ہاتھوں میں ہے وہاں عوامی کارناموں کی نثری اور شعری مدحیں عروج پر نظر آتی ہیں۔ قدیم عہد میں شعرا کی مدحیہ تخلیقات آقاؤں اور امرا کے نظری و عملی مقاصد کی تفاسیر ہوا کرتی تھیں۔ شعرا یا تو خود بالائی طبقوں سے متعلق تھے یا پھر ان طبقوں کے عطا کردہ زر و سیم کی بدولت معاشرے میں اہم مقام حاصل کر لیتے تھے۔ ہماری تاریخ میں (اردو ادب) قرض کی مے پینے والے جو شاعر نظر آتے ہیں ان کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس دور سے تعلق رکھتے تھے جب امرا کیا حکمران بھی فرنگیوں کے تابع ہو چکے تھے اور شاہی خزانہ سرکاری وظیفوں کی روداد کہتا تھا۔ قدیم درباری شعرا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ جن آقاؤں کے وہ مدح سرا ہیں انہوں نے لاکھوں انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ بار برداری کے جانور بن چکے ہیں اور انسانوں کی بجائے اشیائے استعمال بن کر رہ گئے ہیں (ملاحظہ ہو اہرام مصر کی تعمیر میں مصروف غلام بحوالہ نظر نامہ از محمود نظامی) اور ان پر ہونے والے تشدد کا منظر نامہ۔ قدیم ادوار میں بھی شاعر اور دانشور اپنے ممدوحین کی قربتیں حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لئے حسد و رقابت کا بازار بھی گرم ہوتا تھا۔ ذاتی چپقلشیں اور آپس کے معرکے (لٹھ بردار بھی) بھی دیکھنے میں

Scanned by CamScanner

آ سکے۔

پروفیسر کرار حسین نے اپنے ایک مضمون میں پرانے قصیدہ گو شعرا کے
حق میں ہر ممکن عقلی اور سماجی جواز پیش کیا ہے۔ اس مرحلے پر ان کے نقطہ نظر کا جائزہ
ہے تا کہ ہم عربی، فارسی اور اردو کے قدیم قصائد کے لیے ہمدردانہ تنقیدی معیار حاصل کر

کرار حسین لکھتے ہیں (امیر خسرو کے عہد میں)

"سلطان کی شخصیت سے قطع نظر سلطنت کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف ایک ضروری بلکہ مقدس ادارہ ہے اور سلطان اس کا نمائندہ ہے۔ اس کی شخصی علامت ہے۔ سلطنت نہ صرف بربریت کے خلاف تہذیب کے چاروں طرف فساد کے خلاف تکوین کے چاروں طرف ایک حصار ہے بلکہ وہ اس نظام عدل کا دنیوی نمونہ ہے جس پر خدا کی کائنات قائم ہے۔ اسی سے شوکت اسلام وابستہ ہے۔

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ
مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

عقیدہ کے لئے علامت اور حقیقت کی دوئی مٹانا کوئی مشکل امر نہیں جتنے قصیدے فارسی اور اردو میں لکھے گئے ہیں تم ان میں ممدوح کے ذاتی کردار کی طرف کوئی اشارہ نہیں پاؤ گے بلکہ قصیدہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ قصیدہ ایک سلطان کی جلالی صفت یعنی شجاعت اور اس کی جمالی صفت یعنی سخاوت کے حضور فن و شعر کی طرف سے ایک خراج عقیدت ہے۔ یہ کسی سلطان کا تشخص اس کی IDENTITY نہیں ہے بلکہ ہر سلطان کی IDENTIFICATION کے لئے ایک مثال یا تمثیل یا امیج ہے"(۱)

[illegible] نے اس عہد کے دربار کو ثقافتی مرکز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے

"اس زمانے کا دربار ایک ثقافتی مرکز بھی تھا۔ بادشاہ اور امرا شعر وفن کی سرپرستی کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور ساری مہذب دنیا میں شعر وفن کی قدر و قیمت کے لیے بھی ایک بازار تھا۔ لوک گیت اور کہانیوں کے علاوہ باشعور ادب کے مرکز دربار اور خانقاہ ہی تھے۔ درباری شاعر سلطان کے قصیدے لکھتا تھا بالکل جس طرح ملک اور قوم کے استحکام کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا آج کل کے ادیب کا فرض ہے اور کچھ تاریخی واقعات پر نظمیں بھی لکھتا تھا جس طرح حکومتوں کا پبلسٹی کا محکمہ کام کرتا ہے" (۲)

مذکورہ حوالے سے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ صنف قصیدہ قدیم عہد کی بادشاہت (نظام بادشاہت) کے لیے ایک موثر ہتھیار تھا۔ شاعر اس صنف میں ایک طرز حکومت اور ایک طرز زندگی کو سراہتا تھا۔ اچھا شاعر امرا یا بادشاہ کی کٹھ پتلی نہیں ہوتا تھا۔ وہ شعر کو سخن کا پردہ کرتا تھا اور اسے اپنا فن بناتا تھا۔ شعرا بادشاہوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے اور کہتے تھے وہ دنیا میں ایسے کام کریں جن سے ان کی آخرت سنورے۔ وہ بادشاہوں کو موت اور فنا کے تصورات کے حوالے سے باور کروادیا کرتے تھے کہ انسان دنیا میں خاک کا ذرہ اور پانی کا بلبلہ ہے۔ اس لیے جہاں تک ہوسکے دنیا میں ظلم سے گریز کرے اور مستحقین تک ان کا حق پہنچائے۔

صنف قصیدہ کی ماہیت پر علمی بنیادوں کے حوالے سے تو ہمارے تذکرہ نگاروں محققوں اور نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن محض علمی حوالے سے ہم کسی فنی مسئلے یا معاملے کے تمام تر متعلقات کی نشاندہی نہیں کرپاتے۔ اس تناظر میں اس کی احوالاتی بنیادوں تک رسائی ناگزیر ہے۔ ویسے بھی علم یا سائنس کا تعلق تجرباتی آزمائشوں سے ہوتا ہے۔ جب کہ فن

و بھی حقیقت بن جاتی ہے کسی بھی اسرار جاتا ہے اور ترجیح والا خیال جس طرف [illegible]
ہے کہ کسی بھی صنف یا ادبی مسئلے کی تمام تر جہات کو قابو میں لانے کے لیے اس [illegible]
پہلوؤں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے داخلی رجحانات سے مطالعہ کرنا بھی ضروری [illegible]
ہے اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ کسی حقیقت کی تفہیم کے لیے اس کے جوہری [illegible]
ہے۔ کوئی بھی حقیقت ادبی بنیادوں کے اعتبار سے اگر جمالیاتی نہیں بھی ہے تو بھی اس کی [illegible]
سمجھنے کے لیے اس کے خارجی نظام کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی صورت حال پر توجہ مرکوز کرنے
کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اصناف فن و ادب جہاں مخصوص زمانی و مکانی تقاضوں کی پیداوار
ہوتی ہیں وہاں ان کا تعلق مخصوص تہذیبی معیارات سے بھی ہوتا ہے۔ اصناف ادب کے [illegible]
کی شناخت کے لیے ہمیں ان کے داخلی و خارجی فنی معیارات کے ساتھ ساتھ ان سے [illegible]
تہذیبی تقاضوں کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔

اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں ہے کہ اردو ادب میں قصیدہ فارسی زبان و ادب
کے وسیلے سے داخل ہوا۔ فارسی ادب میں یہ صنف عربی کی وساطت سے شامل ہوئی۔ عربی
میں بھی اس پر قبل اسلام کے ادب کی گہری چھاپ موجود تھی۔ اس کا تہذیبی مزاج بوقلمونیت
حامل ہے۔ اس پر قدیم جاہلی عربی، جدید اسلامی عربی تہذیبوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ
قدیم و جدید ایرانی تہذیب کے بعض کوائف بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں جب قصیدہ ایرانی ادب
کے وسیلے سے اردو میں داخل ہوا تو اس پر مقامی ہندی تہذیب نے بھی خاصا اثر ڈالا۔ ان
امور پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس صنف کی دیگر احوالاتی بنیادوں اور خارجی فنی نظام
بھی پرکھنا ہے۔ صنف قصیدہ کے خارجی نظام کی وضاحت میں ادبی علما نے ضخیم دفتر سیاہ کیے
ہیں لیکن اس کی احوالاتی بنیادوں کی نشاندہی خال خال ہی ہوئی ہے۔

قصیدہ کا شاعر کی ذات اور اس کے سماجی مقام سے کیا ربط ہے؟ اس صنف کے
اخلاقی، جمالیاتی اور نفسیاتی اثرات کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ہنگامی مقصد برآری کے لیے لکھا

Scanned by CamScanner

محتاج ہے یا اس کی کوئی مستقل اہمیت بھی ہے؟ قصیدہ کا زمان و مکاں محدود ہے یا وسیع؟ اس کی خارجی اور داخلی ہیئت ترکیبی کلیت ہے یا منتشر کلیت؟ اس کی مابعد الطبیعاتی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت کیا ہے؟ اس تناظر میں اس کے امکانات کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ اس کے جذباتی فکری اور فنی نظام کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ صنف عقیدہ کی نشوونما کا ذریعہ ہے یا محض نمائش عقیدہ کا وسیلہ؟ قصیدہ کے کلاسیکی تنقیدی معیارات کس حد تک عصری ہیں اور اس کے عصری تنقیدی معیارات کس حد تک روا؟ ان سوالوں کا جواب ہمارے لئے قصیدہ فہمی کے نئے راستے تلاش کر سکتا ہے۔

یہ حقیقت اٹل ہے کہ دور جدید میں صنف قصیدہ اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ معاصر ادبی منظر نامہ شاہد ہے کہ اکا دکا نعتیہ یا منقبتی قصائد کے علاوہ اس صنف کی زنبیل میں اور کچھ نہیں ہے۔ بادشاہ، وزیر ریاستی نواب یا امرا کے زوال کے ساتھ قصیدے کے زوال کو بھی منتج کیا جاتا ہے اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ خدا، رسول، خلفا، آئمہ اور پیروں، فقیروں سے ہمارے شعرا کی گہری وابستگی ہے مگر مذہبی قصیدہ بھی آج تعداد میں اتنا کم لکھا جا رہا ہے کہ اس پر الشاذ کالمعدوم ہی کا اطلاق ہونا چاہئے۔ اس کی بنیادی وجہ جدید دور کی شاعری میں در آنے والی نئی اصناف ہیں نظم معریٰ، نظم آزاد اور نثری نظم کے دائروں میں سفر کرنے والے شعرا کے لئے قدیم اظہاریاتی وسائل سے استفادہ کرنا امر محال ہے۔ ردیف و قوافی اور اوزان کی قید سے نجات پانے والے صنائع بدائع کی پرخار وادیوں میں قدم رکھنے سے گریزاں ہیں۔ قدیم شعری فنون اور کلاسیکی وسائل اظہار کی افادیت عہد جدید میں ختم ہو چکی ہے۔ نئی طرز کا علامتی اظہار، شعور کی رو کا بہاؤ، اختلال حواس کی نئی تکنیکیں، دور از کار تلازماتی سلاسل، قواعد سے منحرف لسانی شکلیں اور ان کے ساتھ ساتھ سیدھے اور براہ راست اسالیب کا استعمال، عہد جدید کے شعرا کو قدیم شاعرانہ معیارات سے گریزاں رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اگرچہ صنف قصیدہ اپنی مقصدیت کھو چکی ہے تاہم اس کے شاندار ماضی اور اس کی عظیم

Scanned by CamScanner

شعری روایات کو اسی طرح کی عظیم عمارتوں سے دیکھا جا سکتا ہے جس طرح سے ہم

انسانی تعمیرات یا کلاسیکی معیارات کی حامل یہ عمارات مصوروں کا ذہن کو دیکھنے

عمارات اور یہ اپنے مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر عہد نو کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی

سے ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ان کی تاریخی، روایاتی اور مطالعاتی اہمیت سے انکار ممکن

صنف قصیدہ پر ہمارے تمام تر مباحث اسی تناظر میں ہیں۔ یہ صنف ہمارے ادب میں

ہی اہمیت کی حامل ہے جیسی فن تعمیر میں تاج محل، لال قلعہ یا مسجد وزیر خاں۔ نئے دور کے

تعمیر میں ان عمارات میں استعمال ہونے والے میٹیریل، صناعی اور تعمیری قواعد و ضوابط

علاقہ نہیں رکھا گیا۔ تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آج کے دور میں ان کی اہمیت مکمل طور پر

ہوگئی ہے۔ صنف قصیدہ سے انصاف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اسے مذکورہ معروضات

روشنی میں پرکھیں۔ اس مقام پر ہم ان سوالوں کے اجمالی جواب تلاش کرنے کی کوشش کر

ہیں جو اس صنف کی احوالاتی بنیادیں دریافت کرنے کے حوالے سے ہمارے سامنے آ

ہیں۔ کیا قصیدہ بادشاہ، امیر، قبائلی سردار، روحانی شخصیت، سماجی اخلاق کی ضرورت ہے یا شا

کی؟ اس سوال کا جواب دیگر سوالوں کے جوابات میں آسانی پیدا کرے گا۔

جہاں تک بادشاہوں، امیروں اور قبائلی سرداروں کا تعلق ہے ایسی ان گ

شہادتیں موجود ہیں جن سے استنباط ہوتا ہے کہ وہ ذاتی نام و نمود یا اپنے کارناموں کو حیا

جاوید بخشنے کے لئے شاعروں کو ایک ضرورت کے طور پر قبول کرتے تھے۔ عرب سرداروں

قبیلے میں شاعر کی پیدائش پر خوشی منانا (۳)، بادشاہوں کا اپنے درباروں میں ملک الشعر

منصب قائم کرنا اور امرا کا شاعروں کو اپنے حلقہ اثر میں شامل کرنا اس امر کی دلالت ہے

اولین سطح پر ممدوحین کو شاعروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ

وقات شاعر بھی اپنے معاشی اور سماجی حالات کی دگرگونی سے تنگ آ کر عازم دربار ہوا کر

ے۔ انعام و اکرام کی بارش یا صلے کی چاٹ انہیں مداحی پر مجبور کرتی تھی۔ یوں یہ صنف بعض

Scanned by CamScanner

ضرورت بن جاتی تھی۔ کبھی شعرا صلے کی تمنا یا کسی اور نوع کے خارجی دباؤ کے تحت بھی مدحیہ قصائد لکھ لیتے تھے۔ یہ ان کی طبعی پسند ناپسند کا مسئلہ تھا۔ جہاں تک روحانی شخصیات اور مذہبی ہستیوں کی مدح میں لکھے گئے قصائد کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ عربی، فارسی اور اردو قصیدہ گو شعرا کی غالب اکثریت کا تہذیبی مزاج مذہبی تھا۔ ان کے قلم سے نکلنے والے مذہبی قصائد ان کی ایمانی اور اعتقاداتی ضرورتوں کے تابع تھے۔ پیر، صوفی، بزرگ، ولی، امام، خلیفہ، پیغمبر، بذاتہ ایسے مقامات کے حامل ہوتے ہیں کہ انھیں مدح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ سلطنت کے وجم سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ البتہ ان کی مدح وثنا انفرادی اور اجتماعی افادیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ انفرادی سطح پر شاعر اپنے دینی، مذہبی اور صوفی ہیرو کے کردار اور سیرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے باطن کو بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ذخائر سے مالا مال کرتا ہے اور اجتماعی سطح پر ان کے اعلیٰ اوصاف سبق آموز اور قابل تقلید ہوتے ہیں۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد شاعروں کی اخلاقی اور دینی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں ہر نوع کے عذاب سے چھٹکارے، شفایابی اور حصول مقام و مرتبہ کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مذہبی قصائد میں مذہبی ہستی یا شخصیت کی عظمت کا اعتراف اگر جذبات صادق سے بہرہ مند ہو کر کیا جاتا ہے تو قصیدہ نگار و قارئین سرمدی راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اعلیٰ مذہبی قصائد علم و آگہی، شعور و عرفان اور بصیرت و ایمان کی روشنی رکھنے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ کمالات کے عمدہ نمونے بھی ہوتے ہیں۔ نعت و منقبت کے قصائد شاعروں کے دلوں، روحوں اور ضمیروں میں موجزن عشق و شعور کے دائمی جذبات کے ترجمان ہوا کرتے ہیں۔ بلند پایہ نعتیہ، حمدیہ اور منقبتی قصائد میں لفظ و معانی اور اسلوب و شعور کی ہم آہنگی فکر خیزی کا باعث ہے۔ اس میدان میں وہی شعرا قدم رکھتے ہیں جن کے دل حرارت ایمانی کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ نعتیہ قصائد میں شاعروں کی عقیدت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ نعتیہ قصیدے لکھنے والے شعرا ایک سطح پر بوسیلہ ممدوح انسانی سماج کی حقیقی، اخلاقی اور انسانی صورتوں کو منعکس کر رہے ہوتے ہیں تو

Scanned by CamScanner

دوسری سطح پر انفرادی ایمان کے شاہد ہوا کرتے ہیں۔ اس میدان میں کم تر درجے کے شعرا کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری میں فن و معانی کے اعتدال کا فقدان ہوتا ہے۔ محمد نجف علی خاں مرادآبادی کا کہنا ہے "ایسا نہ ہو کہ محاورہ میں جو کلمات حمد و نعت و منقبت میں لکھے جاتے ہیں وہ سلاطین اور امرا کی مدح میں لکھے جائیں اور ایسے ہی برعکس اس باب میں تمیز شرط ہے" (۴) یوں دیکھا جائے تو مذہبی قصائد شاعر کی ضرورت ٹھہرتے ہیں مذہبی شخصیت کی نہیں۔ ان کے وسیلے سے وہ خیر و برکات بھی حاصل کرتا ہے اور فکری اور دینی گہرائیوں کی پرمایہ اقلیم بھی۔

جہاں تک سماجی اخلاق کا تعلق ہے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جھوٹ، منافقت اور ریاکاری کے رجحانات تہذیبی، اخلاقی اور سماجی سانچوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علما نے صرف ایسی مداحی کو جائز قرار دیا ہے جو ممدوح کے استحقاقی تقاضے کے تابع ہو۔ ایسی مدح جو کسی کے حقیقی کارناموں کو سراہنے کے ضمن میں ہوگی منافقت، ریاکاری اور جھوٹ کے رویوں سے پاک ہوگی۔ اس نوع کی مدحیں سماجی اخلاق کی ضرورت ہوا کرتی ہیں۔ کسی تہذیب کو بالیدگی عطا کرنے میں بھی ممد ہوتی ہیں، اعلیٰ، ارفع اور افادیت کے حامل کارنامے سرانجام دینے والے افراد کی عظمتوں کو سلام کرنا سماج کو درست راہ دکھاتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید میں ہم نے مذکورہ بالا سوالات کے اجمالی جواب دینے کی کوشش کی ہے اور یوں ان نتائج تک پہنچے ہیں کہ قصیدہ کا قصیدہ گو شاعر کی ذات اور سماجی مقام سے گہرا رابطہ ہے۔ اس کے اخلاقی، جمالیاتی اور نفسیاتی اثرات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حقیقی مدح پر مبنی قصائد کئی سطحوں پر قارئین اور شعرا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی رہنمائی ہوتی ہے۔ ان میں اعلیٰ سطح کا جمالیاتی ذوق بیدار ہوتا ہے۔ ان کی شخصیات میں کارنامے سرانجام دینے کی تمنائیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ قصائد جو جھوٹی مداحی پر مبنی ہوتے ہیں ان میں شاعرانہ خلوص کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے قصائد ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جن قصائد میں

Scanned by CamScanner

ممدوحین کی حقیقی کردار کی عظمتیں بھرپور شاعرانہ صداقت اور خلوص سے پیش کی جاتی ہیں ان کی مستقل اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قصیدہ کا زمان و مکاں تو اس لحاظ سے محدود نہیں ہے کہ یہ دور جاہلی سے عصر حاضر (حمدیہ، نعتیہ منقبتی قصائد) تک مستقل لکھا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب حمد و نعت کے قصائد بھی خال خال نظر آتے ہیں تاحال مذہبی قصیدہ موجود ہے۔ البتہ دنیاوی ممدوحین کی شان میں لکھے جانے والے قصائد بادشاہوں اور ریاستی نوابوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم کہہ سکتے کہ قصیدہ کا زمان و مکاں کسی بھی صورت محدود نہیں ہے۔ قصیدے کی ہیت میں دنیاوی یا مذہبی شخصیات کی شان میں اگر کچھ نہ بھی لکھا جائے تو بھی تعریف یا برائی کے جذبات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ کسی کی تعریف کرنا کسی کی برائی کرنے ہی کی طرح سے انسان کا حقیقی اور فطری جذبہ ہے۔ یہ جذبہ برقرار رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تعریف یا برائی کے رجحانات مخصوص یا متعینہ سانچوں کے پابند نہ ہوں۔ دنیا کے مختلف نظریاتی اور غیر نظریاتی ممالک اپنے اپنے کارناموں کی توصیف و تحسین کے لئے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اپنی پالیسیوں پر کتابیں لکھواتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کرتے ہیں۔ آج بھی سپاسنامے۔ تہنیت نامے، سہرے، تقریباتی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ سیاسی پارٹیاں شاعروں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ قومی لیڈروں، سیاسی شخصیتوں اور ملکی سربراہوں کی شان میں نظمیں، قطعے، غزلیں، رباعیاں، آزاد نظمیں اور معری نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔

جہاں تک قصیدے کی مروجہ فارم کے حوالے سے داخلی اور خارجی کلیتوں کی ہم آہنگی کا تعلق ہے تو وہ قصائد جن میں اظہار خلوص، فن پر عبور اور مداحی کا حقیقی جواز ہو گا ان کی خارجی اور داخلی کلیت میں ہم آہنگی نظر آئے گی۔ متضاد صورتوں میں انتشاری کلیت ہی کا قصیدہ رقم ہو سکے گا۔ اس کا ہر جزو علیحدہ تو ہو گا ہی باہم گر متضاد بھی دکھائی دے گا۔

قصائد کی مابعد الطبیعاتی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبی سطح

Scanned by CamScanner

پر اس صنف نے تسلیم و رضا کا درس دیا ہے۔ اپنی شخصیت اور ذات سے بالاتر کی ہستی کی تعریف انسانوں میں کسر نفسی کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ ان کے اندر ماننے اور تسلیم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مسلم تہذیب میں تسلیم و رضا کے رجحانات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ قصائد کی تاریخی اہمیت غیر نزاعی ہے۔ ان میں مادحین اور ممدوحین کی شخصیات کی لفظی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی ادوار کی چند تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اردو، عربی اور فارسی قصائد نے ممدوحین کے استحکام کے لئے بطور تشہیری سلاسل اعانت کی ہے اور یہ ان کے لئے مناسب راہنمائی کا سبب بنے ہیں۔

قصیدے کی تہذیبی اہمیت کا کچھ ذکر ہو ہی چکا ہے یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ یہ اہمیت مذہبی حوالے سے بھی ہے اور دنیاوی حوالے سے بھی۔ مذہبی حوالے سے اس صنف نے ایمان اور عقائد کے استحکام کا کام کیا ہے اور دنیاوی حوالے سے اس میں مختلف زمانوں کے تہذیبی ماحول کے نمایاں آثار محفوظ ہیں۔ مذہبی قصائد کے تناظر میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا قصیدہ عقیدے کی نشو و نما کا وسیلہ ہے یا نمائش عقیدہ کا ذریعہ؟ اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ وہ قصیدہ نگار جو خلوص سے عاری اور لاتعلق ہو کر یا دوسروں کے عقائد کو محترم نہ جان کر مذہبی شخصیات کی مدح و ثنا کریں گے تو ان کے ہاں عقیدہ نمائش تک ہی محدود رہے گا اور اس میں تعصب کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ وہ قصیدہ جو خلوص اور جذب کے کوائف کے تابع ہو کر لکھا جائے گا عقیدے کی نشو و نما اور اس کی توسیع میں ممد و معاون ہو گا۔ اس کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یہ ایک عمومی اصول ہے کہ قارئین پر تاثیر میں ڈوبے اشعار کا گہرا اثر ہوتا ہے۔

قصیدے کے کلاسیکی تنقیدی معیارات کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف میں ارتقا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی غزلیہ ہیت کی زنجیروں اور اجزا کی کڑیوں کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ شاعر ان سے دامن چھڑا کر کسی اور ہیت کے میدان میں تو داخل ہو سکتا ہے یدے سے متعلق نہیں رہ سکتا۔ اگر قصیدہ موضوعاتی حوالے سے قصیدہ کہلاتا تو اس میں ارتقا

Scanned by CamScanner

[illegible]

قصیدہ کے ارکان کے حوالے سے شبلی نے لکھا ہے

"مختلف شاعرانہ مضامین کے لئے قصیدہ سب سے بڑا میدان ہے۔ مثنوی کے لئے مسلسل طول طویل قصہ کی ضرورت ہے۔ غزل میں چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات ادا کئے جاتے ہیں۔ باقی ہر قسم کے مضامین جو ان دونوں قسموں کے بیچ ہیں وہ صرف قصیدہ کے ذریعے سے ادا کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی دوست جدا ہو رہا ہے، کسی نے کوئی ناموری کا کام کیا ہے، کوئی موثر منظر نظر سے گزرا، کسی گروہ کے تمدن یا معاشرت کی تصویر کھینچنا ہے، اس قسم کے تمام مضامین صرف قصیدہ میں عمدگی سے ادا ہو سکتے ہیں" (۵)

شبلی نے بھی قصیدے کی ہیئت میں ترمیم کا مسئلہ پیش نظر نہیں رکھا۔ نظم آزاد اور نثری نظم کی ہمنت آزادیوں کے زمانے میں قصیدہ کی ہیئتی پابندیاں خاصی تکلیف دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں (دور جدید میں موجود اشتیاق کے حوالے سے) زیادہ قصائد نہیں لکھے جا رہے۔

قصیدہ عربی، فارسی اور اردو اصناف سخن میں ایک نادر، منفرد اور شکوہ آشنا صنف سخن ہے۔ یہ قدیم ترین شعری صنف ہونے کے ساتھ ساتھ طویل ترین زمانی اور ادبی مسافت کے آثار سے مالا مال ہے۔ اس میں شاعرانہ تجربے کی بوقلموں صورتیں اور معانی آفرینی کی رنگارنگ

Scanned by CamScanner

تاثیر میں منعکس ہوتی ہیں۔ اسالیبی شان و شوکت اور پرواز تخیل کے اظہار
تخصیصی مقام کی حامل ہے۔ لفظی و معنوی خصائص کے حوالے سے اسے بجا طور پر
الشان صنف سخن کہا جاتا ہے۔ یہ صنف اتنی ہی رفیع الشان ہے جتنے اس کے ممدوح
رفیع الشان ہوتے ہیں۔ جس طرح کا شکوہ، وقار اور جلال ایک برگزیدہ اور بڑی
شہنشاہ اور اس کے دربار کا ہوتا ہے اس صنف میں اس قسم کے جلال و جمال سے
میں آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ قصیدہ بنیادی طور پر مدح کے لئے مخصوص ہے لیکن یہ کہنا کہ
شاعر ہمیشہ صلہ حاصل کرنے کے لئے قصیدہ لکھتا تھا صنف سخن اور شاعر دونوں پر بہتان
اگر ایسا ہوتا تو اس صنف میں جلال و جمال کے عناصر دکھائی نہ دیتے اور اس میں محض
اجر کا تعلق یا مطلب پرستی کا عنصر نظر آتا۔ یہ درست ہے کہ بعض قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ کو
معیشت کے سہارے کے بطور استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ حقیقت بھی فراموش
نہیں کرتے تھے کہ جب تک الفاظ و معانی کا تاج محل وجود میں نہیں آئے گا وہ ممدوح کے
نزدیک صلہ کے مستحق نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ صنف قصیدہ میں معیشت طلبی کو دوم اور شعر
زیبی کو اول حیثیت حاصل رہی ہے۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔
ان میں مدح کا بنیادی محرک شاعر کا ایمان اور عقیدہ ہے۔ ان میں شاعر کی داخلی اور روحانی
شخصیت پورے طور پر سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس لئے مذہبی قصائد معیشت سہارگی کے عیب سے
کلیتاً بری ہیں۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ قصیدہ کا ممدوح شاعرانہ مبالغہ کے
تیروں کا ہدف بنتا ہے اور وہ اس کے لگائے ہوئے زخموں کو اپنی مدح کی تسکینی زبان سے
پاٹ کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ بات عمومی عقل سے تعلق رکھتی ہے کہ جس مبالغہ تک
ترضین کی رسائی آسانی سے ہے اسے ممدوح قصیدہ کیوں نہیں پا سکتا خصوصاً اس حوالے سے
کہ قدیم عہد میں بادشاہ اور امرا علم، تہذیب اور شعور کی بلند سطحوں سے آشنا ہوتے تھے۔

Scanned by CamScanner

ممدوح جانتا تھا کہ شاعر اس کی مدح میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے شاعر کے موضوعات، مضامین، خیالات اور اسالیب اظہار اہم تھے۔ وہ شاعر کے شاعرانہ کمال کی شناخت کیا کرتا تھا۔ بغور دیکھا جائے تو مبالغہ ہی قصیدہ کی جان ہے۔ یہی وہ کوہ ہمالہ ہے جسے سر نہ کر سکنے کی وجہ سے قدیم و جدید شاعرانہ ادوار میں ہر کوئی قصیدہ نگار نہیں بن سکا۔ عقلی طور پر بالغ اور علمی طور پر فاضل ممدوحین کی مبالغہ آرائی پر مبنی مدح ان کی باطنی ضرورت نہ تھی۔ البتہ یہ شاعر کی حاجت ضرور تھی۔ یہ صنف ممدوح کی آزمائش نہیں مدح نگار کا امتحان ہے۔ مبالغہ کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی وضاحت دیکھیے

> "اگر اعتراض اس بات پر ہے کہ دور جاہلیت کے عربی قصیدوں میں تفاخر سے کام لیا جاتا تھا تو اعتراض میں قدرے وزن ہے۔ لیکن اس کے باوجود مبالغے کے تحت کچھ جذبات بھی موجود ہوتے تھے جو حقیقی شاعری کی شرط اول ہے۔ انداز بیان میں مبالغہ اور اغراق یونانی شعرا میں نیز انگریزی میں ملٹن وغیرہ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب علم بلاغت میں اسے بعض مواقع کے لئے جائز قرار دیا ہے"
> (۶)

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ مدح کے حوالے سے قصائد میں ملنے والی مبالغہ آرائی کا کیا جواز ہے؟ یہ صدی جس میں ہم زندہ ہیں سائنسی معراج کی صدی ہے۔ سائنس کا انحصار تجربے اور مشاہدے پر ہے۔ سائنسدانوں نے ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ داستان امیر حمزہ کا عمر بھی ورطہ حیرت میں ڈوبا ہے۔ اڑن کھٹولے، اڑنے والے قالین، الہ دین کا چراغ، جام جہاں نما، کھل جا سم سم یہ سب کچھ سائنس آشنا صدیوں سے قبل کے انسانوں کا خواب تھا۔ آج نئے عہد کے انسانوں نے ان انسانوں کے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ہوائی جہاز، راکٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر وی سی آر اور کائنات کے

Scanned by CamScanner

رازہائے سربستہ کے روز افزوں انکشافات۔ آج یہ سب کچھ مبالغہ نہیں حقیقت ہے

ہم جدید سائنس فکشن پڑھیں یا سائنس کے حوالے سے بننے والی فلمیں اور ڈرامے دیکھیں

ہمیں مبالغہ کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ گزشتہ دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر سائنس فکشن

سیریز کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ایک کا نام سکس ملین ڈالر مین ہے اور دوسری کا بائیونک

ان میں اول الذکر کا ہیرو مرد کردار اپنے جسم میں طاقت و شعور آفریں سائنسی آلات علم

کے اور اسی طرح ثانی الذکر کی ہیروئن سائنسی ایجادات کی توانائیاں سمیٹ کر ایسے ایسے حیرت

خیز کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ ہم جدید سائنسی داستانوں کے امیر حمزاؤں اور عمر عیاروں

سے آشنا ہوتے ہیں۔ یوں ہم جان سکتے ہیں کہ انسان کو مبالغے سے کسی بھی دور میں نجات نہیں

مل سکتی۔ کائنات کو مسخر کرنے کے لئے عجوبہ خواب تو دیکھنے ہی پڑیں گے۔ جب تک انسان کے

باطن میں زندگی کو تسخیر کرنے کا جذبہ موجود ہے اس کے خواب بھی زندہ ہیں۔ وہ خواب جن کا

حقیقت ہونا ضروری نہیں ہے۔ بات مبالغہ آرائی کی ہو رہی تھی، بات کو بڑھا چڑھا کر بیان

کرنے کے عمل کی ہو رہی تھی، اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی ہو رہی تھی کہ جھوٹ کی حدیں

بھی کوسوں پیچھے رہ جائیں، لیکن کیا مبالغہ صرف ہمارے قصیدوں ہی میں تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسا

نہیں تھا ہماری شاعری کی دیگر اصناف کو بھی اس سے مفر نہ تھا۔ یہ اس عہد کی طرز زندگی اور طرز

تہذیب کا حصہ تھا۔ خیال کی کمند جتنی بھی دور پھینکی جا سکے پھینکی چاہیے، ورنہ انسان معلوم کے

دائروں ہی میں بند ہو کر زندگی گزار دے گا۔ ہمارے شاعر بھی خیال کی کمندوں سے ان گنت

نامعلوم خیالات کو معلوم کی وادیوں میں کھینچ لاتے تھے۔ صرف یہی نہیں مبالغہ حسن پیدا کرتا تھا،

خیال موثر اور بات آبدار ہو جاتی تھی۔ مبالغہ کی بدولت خیالات کی اقلیم میں رنگا رنگ رونقیں آ

بستی تھیں۔ مبالغہ آرائی پر محض قصیدہ نگاروں کو معتوب ٹھہرانا انصاف نہیں ہے۔ اس دائرے

میں داستان نویس بھی تھے اور خطیب بھی، تقریظ نگار بھی تھے اور تاریخ نویس بھی، قصیدہ نگار بھی

تھے اور مرثیہ گو بھی، مثنوی نویس بھی تھے اور ہجو گو بھی۔ قصیدہ نگار شعرا اگر کسی ممدوح کی مدح میں

Scanned by CamScanner

مناظر فطرت کے بیان اور فلسفہ و حکمت کے موضوعات کے اظہار کے حوالے سے مبالغہ کا دامن تھامتے تھے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

کسی قوم کے دور عروج کے ممدوح تو کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی وجہ سے لائق تحسین ہوتے ہی ہیں، دور زوال کے ممدوحین بھی بے وقوف، نادان یا کم عقل نہیں ہوتے تھے۔ ملکی فتوحات یا توسیع پسندانہ عزائم کی عدم موجودگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حکمران اور بادشاہ علم و فضل کی دولت سے محروم ہوتے تھے۔ دور زوال میں بھی (ہندوستانی مسلمان) نوابوں اور امرا کی تربیت کچھ اس طور ہوا کرتی تھی کہ وہ فنون حرب، فنون لطیفہ اور علوم معقولہ و منقولہ سے مہارت کی حد تک آگاہ ہوتے تھے۔ یہ ممدوحین مبالغہ آرائی کو ذاتی انا کی غذا کے طور پر قبول کرنے سے زیادہ اس سے پیدا ہونے والے شعری حسن سے اثر و سرور حاصل کرتے تھے۔ مغربی علوم کے زیر اثر پیدا ہونے والی اردو تنقید میں اگر مشرقی شعری معیارات کا مذاق اڑایا گیا ہے تو یہ اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب میں انگریزی زبان اور اس کے ادب کے فروغ پاتے ہی عربی اور فارسی السنہ کے رسوخ میں کمی واقع ہوئی۔ ان زبانوں میں موجود ادبی اور تہذیبی سرمایے اور معیارات سے ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق قطع ہونے لگا۔ انگریزی ادب کے اثرات کے تحت حالی نے ادبی اصلاحی تحریک کے حوالے سے مشرقی ادبی معیارات میں ترامیم و اضافہ کا علم بلند کیا۔ واقعیت اور حقیقت پسندی پر اس شد و مد سے اصرار ہونے لگا کہ نئے قارئین اپنے علم بیان کی ابجد تک بھول گئے۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا موثر حربہ ہے۔ مغرب زدگی کے حوالے سے اس کا مذاق اڑا کسی انسان کو اس کی بہادری کی وجہ سے اگر شیر کہہ کر مخاطب کیا جائے گا تو کیا اسے ہم مبالغہ کہیں گے؟ یہ تو استعاراتی اظہار کا حصہ ہے اسی طرح عرق انفعال یا آنسوؤں کو اگر کوئی شاعر موتی کہہ کر تشبیہی اظہار کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو کیا ہم اسے جھوٹ سمجھ کر رد کر دیں گے؟ اگر کوئی شاعر یہ کہہ کر کہ خاک میں دفن ہونے والی حسین صورتیں لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہو گئی ہیں

Scanned by CamScanner

حسن تعلیل کے مسکن کی گھنٹی بجاتا ہے تو کیا ہم اسے توہم پرست یا مجذوب قرار دے
گے؟ ہرگز نہیں انہی امور سے تو شاعری جمال آشنا ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر بڑھتی ہے۔ شاعری
میں سائنسی حقائق یا معاشرتی علوم کے بیان سے ہمیں منظوم علوم کا سرمایہ تو مل سکتا ہے لیکن
یوں ہمارے جذبات شاعرانہ حسن و تخیل کے ذخائر سے محروم سرد خانوں کی زینت بن جائیں
گے۔ البتہ ہم شاعروں سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ضرور ہیں کہ وہ غیر ضروری مبالغہ
آرائی سے گریزاں رہیں۔

جدید سائنسی شعور رکھنے والے شعرا کے ہاں بھی محض عریاں خارجی حقائق نظر نہیں
آتے۔ وہ تجربہ گاہوں سے حاصل شدہ نتائج کو منظوم نہیں کرتے۔ شاعرانہ وسائل اظہار سے کام
لے کر شاعری میں حسن و جمال واثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مبالغہ کو شاعری اور
شریعت میں جائز قرار دینے والے ایک ناگزیر حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱)۔ امیر خسرو اور ان کا عہد، رسالہ لفظ ص ۵۔۶، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

(۲)۔ امیر خسرو اور ان کا عہد، رسالہ لفظ ص ۱۰

(۳)۔ بلوغ الارب، جلد سوم، محمود شکر آلوسی ص ۶۰۵، ۶۰۶ ترجمہ، مرکزی اردو بورڈ لاہور

(۴)۔ احسن القواعد، محمد نجف علی خاں مراد آبادی، ص ۱۹۲) مطبع مجتبائی دہلی

(۵)۔ شعر العجم، جلد پنجم ص ۲۴،

(۶)۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۶ / ۲ ص ۲۸۶ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

Scanned by CamScanner